آپسی اتحاد اور اخوت کا حقیقی عکاس: ڈراما
''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جنما ہی نہیں''

محمد التمش

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد-۵۰۰۰۳۲

altamashkhan033@gmail.com

Mob: 8439852580

ملخص

یہ ڈراما قومی اور بین الاقوامی سطح پر پانچ سو سے بھی زیادہ مرتبہ اسٹیج ہو چکا ہے۔ اس کے اسٹیج کرنے کا سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ کیوں کہ یہ ڈراما دوقومی نظریے کی نفی کرتا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ انسانیت کا درس بھی دیتا ہے اور یہ کسی بھی طرح کی شدت پسندی اور مظالم کے سخت خلاف ہے۔ اس ڈرامے کو ہندوستان کے علاوہ پاکستان، دبئی اور امریکا جیسے کئی ممالک میں بھی اسٹیج کیا گیا ہے۔ تقریباً ہر جگہ یہ ڈراما بہت ہی کامیاب رہا اور اسے خوب سراہا گیا۔ یہ ڈراما بنیادی طور پر دو خیالوں پر مشتمل ہے۔ پہلا یہ کہ اس میں کلچر کی سمجھ ہے یعنی لکھنؤ کے خالص اردو بولنے والے گھرانے اور لاہور کی پنجابی بولنے والی خاتون کا ایک دوسرے سے معاملہ پڑتا ہے، دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے ہیں لیکن جذبات کی زبان بولیوں کی حد بندیوں کی رکاوٹ کو توڑ دیتی ہے۔ دوسری بات مذہبی رواداری کی ہے، حقیقت میں ہر مذہب یہ سکھاتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کا نہ صرف احترام کرو بلکہ ان سے کسی طرح کا کوئی تعصب نہ رکھو۔ یہ ڈراما مذہب کے جھوٹے ٹھیکے داروں پر گہرے طنز کے ساتھ ساتھ انسانیت کی بھی تعلیم دیتا ہے۔

آپسی اتحاد اور اخوت کا حقیقی عکاس: ڈراما
''جس نے لاہور نئیں دیکھا وہ جنما ہی نئیں''

''جس نے لاہور نئیں دیکھا وہ جنما ہی نئیں'' اصغر وجاہت کا بیحد مقبول اور عالمی شہرت یافتہ ڈراما ہے۔ یہ ڈراما ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا شدہ صورت حال کی ایک سچی واردات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جو دونوں ملکوں کے زندہ حقائق اور چشم کشا حالات کے المیے کو انتہائی موثر طریقے سے پیش کرتا ہے۔ اس ڈرامے کا بنیادی قصہ اردو کے مشہور صحافی سنتوش کمار کے سفرنامے ''لاہور نامہ'' سے لیا گیا ہے۔ جس میں ایک عمر رسیدہ ہندو عورت کا ذکر ہے جو تقسیم ملک کے بعد ہندوستان آنے کے بجائے لاہور میں ہی رہ گئی تھی۔ اسی بنیادی خیال کو لے کر اصغر وجاہت نے اپنے ڈرامے کے قصے کا تانا بانا بنا ہے نیز اس میں مزید قصوں کا اضافہ کر اسے مکمل ڈرامے کی شکل دی ہے، جس کی وجہ سے کئی اور دلچسپ کردار نکل کر سامنے آ گئے ہیں۔ دراصل سنتوش کمار ١٩٤٧ء میں تقسیمِ ہند کے بعد لاہور سے ہجرت کر کے دہلی آ گئے تھے۔ ملک کی تقسیم کے اسی فساد میں ان کے بھائی کرشن کمار گورٹو اور ہزاروں بے گناہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ یہ ڈراما انہی بے گناہوں کو انتساب کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے سے متعلق ہندوستان ٹائمس نے لکھا ہے کہ:

> ''اصغر وجاہت کا تعلق اس پنجاب سے نہیں ہے جس نے تقسیمِ ہند کے درد کو محسوس کیا اور نہ ہی وہ ذاتی طور سے اس حقیقت کے شاہد رہے ہیں، لیکن انھوں نے تقسیم کے اس دور کو بہت فنکارانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔۔۔ اصغر وجاہت نے ''جس نے لاہور نئیں دیکھا وہ جنما ہی نئیں'' ڈرامے کو صرف انسانی سانحے تک محدود نہیں کیا ہے بلکہ دونوں کمیونٹی کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی اس کوشش کا مقصد یہ بتاتا ہے کہ دونوں کمیونٹی یا فرقے کے بیچ کیا ہوا کہ ثقافتی اتحاد، مہمان نوازی، محبت، یقین اور آپسی اتحاد ختم ہو گیا۔''

''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جما ہی نہیں'' از اصغر وجاہت وانی پبلیکیشن نئی دہلی ۲۰۰۹ء ص ن ۸۴

اصغر وجاہت نے اس ڈرامے کو بیسویں صدی کی آخری دہائی کی ابتدا میں تخلیق کیا تھا۔ سب سے پہلے اس ڈرامے کو حبیب تنویر نے ''نیا تھیٹر'' کی جانب سے اپنی ہدایت میں شری رام سینٹر دہلی کے لیے ۱۹۹۲ء میں اسٹیج پر پیش کیا تھا۔ انھوں نے ڈرامے کے موضوع میں اور گہرائی پیدا کرنے کے مقصد سے کرداروں اور مکالموں میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے اس میں ردوبدل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے چند ہمعصر شعراء کے کچھ مناسب اشعار کو شامل کر کے اس کی خوبی میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اور ساتھ ہی پنجاب کی مشہور شاعرہ امریتا پریتم کی دل سوز نظم کو شامل کر کے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ مظہر امام اس ڈرامے سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''اصغر وجاہت کا طویل ڈرامہ ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جما ہی نہیں'' حبیب تنویر کی ہدایت میں اسٹیج ہو چکا ہے بطور خاص توجہ چاہتا ہے۔ اصغر وجاہت ہندی افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ ان کا یہ ڈرامہ اپنے موضوع کے اعتبار سے دلچسپ اور موثر ہے۔ حبیب تنویر کی یہ ایک ایسی قابل قدر کوشش تھی جس میں اسٹیج کی خوبیوں کی توقع کے مطابق ڈھالنے کے عمل میں بنیادی قصہ زیادہ وضح اور دلچسپ بن گیا ہے۔''

مظہر امام ''کتاب نما'' جون ۱۹۹۱ء

ڈراما ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جما ہی نہیں'' کو اردو، ہندی کے علاوہ مراٹھی، کنڑ اور پنجابی وغیرہ جیسی زبانوں میں بھی ترجمہ کر کے اسٹیج کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما قومی اور بین الاقوامی سطح پر پانچ سو سے بھی زیادہ مرتبہ اسٹیج ہو چکا ہے۔ اس کے اسٹیج کرنے کا سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ کیوں کہ یہ ڈراما دو قومی نظریے کی نفی کرتا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ انسانیت کا درس بھی دیتا ہے اور یہ کسی بھی طرح کی شدت پسندی اور مظالم کے سخت خلاف ہے۔ اس ڈرامے کو ہندوستان کے علاوہ پاکستان، دبئی اور امریکا جیسے کئی ممالک میں بھی اسٹیج کیا گیا ہے۔ تقریباً ہر جگہ یہ ڈراما بہت ہی کامیاب رہا اور اسے خوب سراہا گیا۔ البتہ پاکستان کے کچھ شدت پسند سیاسی رہنماؤں، شدت پسندوں و پولس محکمے کے لوگوں اور ہندوستان کے کچھ مقامی ہندی اخباروں نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن یہ مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی ہے

کیوں کہ ہندوستان میں یہ مخالفت محض تعصب اورنفرت کی بنیاد پر ہوئی تھی اور پاکستان میں اس لیے اس کی مخالفت کے بعد پابندی لگائی گئی تھی کیوں کہ اس میں مولوی صاحب کا قتل ہوتا ہے جس سے ان کے مطابق ان کے مذہبی عقیدے کوٹھیس پہنچتی ہے، دوسرے یہ کہ یہ ڈراما ایک ہندوستانی ڈراما نگار کا تھا جوان کے لیے نامنظور تھا کہ ایک ہندوستانی پاکستان کی صورت حال کوموضوع بنا کر ڈرامے لکھے۔ حالاں کہ اس ڈرامے میں ایسا کچھ بھی پیش نہیں کیا گیا ہے جو اسلام اور پاکستان کی سیکولرعوام کے خلاف رہا ہو۔ پاکستان میں جب یہ ڈراما پولس محکمے کی اجازت نہ ہونے کے باوجود کراچی کے گوئٹھے جرمن معلوماتی مرکز میں اسٹیج پر پیش کیا گیا تو یہاں پر بھی اس ڈرامے کا ہرشو ہاوس فل ہی نہ تھا بلکہ لوگ پیڑوں پر چڑھ کر ڈراما دیکھ رہے تھے۔ پاکستان کے اخباروں میں جو تبصرے چھپے انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ وہاں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ہماری اور آپ کی طرح سوچتے ہیں اور مذہبی رواداری باہمی وجود کوانسانیت کی پہلی شرط قبول کرتے ہیں۔

اس ڈرامے کو لکھنے کے دوران اصغر وجاہت نے اپنے ایک دوست گروچرن سے نہ صرف پنجابی زبان کے مکالموں کو لکھنے میں مدد لی تھی بلکہ ان کے ہی ذریعے اصغر وجاہت سنتوش کمار کی کتاب سے متعارف ہوئے۔ اردو کے مشہور ڈراما نگار شمیم حنفی نے اس ڈرامے کے اہم اورمتحرک کردار ناصر کاظمی کے کلام سے اصغر وجاہت کو واقف کرایا تھا۔ ناصر کاظمی بھی تقسیم کے دوران ہندوستان کے ایک شہر امبالا کو چھوڑ کر لاہور پہنچے تھے۔ اصغر وجاہت نے ناصر کاظمی کو ڈرامے کا ایک اہم کردار بنا کر اسے اور بھی دلچسپ بنا دیا۔ ساتھ ہی ان کی غزلوں اورنظموں کو ڈرامے میں شامل کر کے ڈرامے کی خوبی کو دوبالا کر دیا۔ ندا فاضلی اس ڈرامے سے متعلق اخبار کے لیے ایک کالم لکھتے ہیں کہ:

> ''ڈرامہ جس نے لاہورنہیں دیکھاوہ جنما ہی نہیں' اصغر وجاہت کی ایک خوبصورت تخلیق ہے۔ آزادی کے بعد اسلامی پاکستان میں ایک اقلیتی کردار کے اردگرد بنا ہوا یہ تاثراتی ڈرامہ اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو قائین کے لیے کافی تازگی کا حامل ہے۔ اس میں ہندو بڑھیا کا مرکزی کردار فلم گرم ہوا' کی نانی کے کردار سے مماثل ہوتے ہوئے بھی اپنی جزئیات اور واقعات کی ترتیب سے نئی پہچان کے ساتھ ابھرتا ہے۔ مشہور شاعر ناصر کاظمی کو بھی اس میں

ایک کردار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔''

ندافاضلی ''ادب نامہ'' ہفتہ واری کالم ممبئی ۱۹۹۱ء

اس ڈرامے کا پلاٹ ہندوستان و پاکستان کی تقسیم کے بعد واقع صورت حال سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد سکندر مرزا کا گھرانہ لکھنؤ سے لاہور پہنچتا ہے۔ یہاں پہنچ کر پناہ گزین کیمپ میں کچھ مہینے گزارنے کے بعد انھیں شہر لاہور کے دل کوچۂ جوہریا میں سرکاری طور پر رتن جوہری کی حویلی الاٹ کر دی جاتی ہے۔لیکن جب سکندر مرزا اپنے اہل خانہ کے ساتھ اس حویلی میں پہنچتے ہیں تو رتن جوہری کی ماں پہلے ہی سے اس حویلی میں موجود رہتی ہیں۔اس بوڑھی عورت کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ کوئی مسلمان گھرانہ اس کے ساتھ اس حویلی میں رہے۔لیکن مرزا صاحب کو اس بات کا ڈر تھا کہ جب تک یہ عورت یہاں رہے گی یہ حویلی ان کی پوری طرح سے نہیں ہو سکتی ہے۔اسی وجہ سے وہ اس خاتون کو ہندوستان جانے کا مشورہ دیتے ہیں،لیکن وہ کسی طرح سے بھی اپنا گھر اور لاہور چھوڑ کر جانے پر قطعی راضی نہیں ہوتی ہے۔ یہ خاتون بہت ہی نیک، رحم دل، مددگار اور فطرتاً حسنِ اخلاق کی مالک ہیں جس نے دوسروں کی خدمت کے جذبے اور اپنے نیک اعمال جیسی خوبیوں کی وجہ سے نہ صرف مرزا کے گھرانے بلکہ شہر کے دوسرے لوگوں کے دل میں جگہ بنالی اور دھیرے دھیرے ان لوگوں کے بیچ ایک خاص رشتہ بھی بن گیا۔لیکن جب شہر کے کچھ شدت پسند غنڈوں کو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ایک ہندو عورت یہاں رہ گئی ہے تو ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اسے یہاں سے نکال کر ہندوستان بھیج دیا جائے تو ایسے میں مرزا کا گھرا ہی انھیں ہندوستان جانے سے روکتا ہے اور ان بدمعاشوں سے بھی بچانے کا وعدہ کرتا ہے۔ کچھ دنوں بعد جب یہ بوڑھی عورت مر جاتی ہے تو سوال اٹھتا ہے کہ اسے دفن کیا جائے یا جلایا جائے۔ محلے کے ایک مولوی صاحب کے فتوے کے مطابق ہندو مذہب کے مرنے بعد کی سبھی رسومات کو ادا کرتے ہوئے اس لاش کو آگ کے سپرد کر کے راکھ کو راوی ندی میں بہا دیا جائے۔ یہ بات شہر کے انہی شدت پسند لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے جس سے وہ طیش میں آ کر مولوی صاحب کا قتل کر دیتے ہیں۔

یہ ڈراما بنیادی طور پر دو خیالوں پر مشتمل ہے۔ پہلا یہ کہ اس میں کلچر کی سمجھ ہے یعنی لکھنؤ کے خالص اردو بولنے والے گھرانے اور لاہور کی پنجابی بولنے والی خاتون کا ایک دوسرے سے معاملہ پڑتا

ہے، دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے ہیں لیکن جذبات کی زبان بولیوں کی حد بندیوں کی رکاوٹ کو توڑ دیتی ہے۔ دوسری بات مذہبی رواداری کی ہے، حقیقت میں ہر مذہب یہ سکھاتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کا نہ صرف احترام کرو بلکہ ان سے کسی طرح کا کوئی تعصب نہ رکھو۔ یہ ڈراما مذہب کے جھوٹے ٹھیکے داروں پر گہرے طنز کے ساتھ ساتھ انسانیت کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ اس کا مقصد قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کو فروغ دینا ہے تاکہ انسانی رشتے اور زیادہ مستحکم اور مضبوط ہو سکیں۔ اس ڈرامے کے ذریعے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دوسرے ممالک خاص کر ہمارے ہمسایہ ملک پاکستان جہاں کے ایک سچے واقعہ پر یہ ڈراما مبنی ہے، وہاں پر مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا سنگم کتنا ناگزیر ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان اس بات کا شاہد ہے کہ ہزاروں سالوں سے مختلف اقوام، مذاہب اور تہذیبیں مل جل کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ڈراما جہاں بھی اسٹیج کیا گیا وہاں نہ صرف یہ کامیاب رہا بلکہ اسے خوب سراہا گیا اور اخباروں و رسالوں میں اس پر مثبت تبصرے لکھے گئے۔ پاکستان کے کراچی سے چھپنے والے ایک اخبار ''ڈان'' میں اس ڈرامے سے متعلق لکھا گیا ہے کہ:

> ''اس ملک میں آج جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ رواداری ہے، جس کی عدم موجودگی ہماری اخلاقی اور سماجی قدر کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اس سیاق وسباق میں تحریک نسواں' تھیٹر گروپ کے ذریعے حال ہی میں پیش کردہ ڈراما ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جنما ہی نہیں'' بہت ہی موزوں ہے۔''

روزنامہ 'ڈان' حوالہ '' جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جنما ہی نہیں'' از اصغر وجاہت وانی پبلیکیشن نئی دہلی ۲۰۰۶ء

''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جنما ہی نہیں'' ڈراما جو اصغر وجاہت نے اردو کے مشہور رسالہ ''ذہن جدید'' کے جلد۔1 شمارہ۔2 میں ۱۹۹۱ء کو شائع کیا تھا۔ اس میں انھوں نے کل اٹھارہ مناظر پیش کیے تھے لیکن جب یہ ڈراما وانی پبلیکیشن نئی دہلی نے کتابی شکل میں شائع کیا تو اس کو سولہ منظروں پر مشتمل کر دیا۔ وانی پبلیکیشن سے شائع کردہ ڈرامے کے پہلے منظر کو کہانی کے پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے، یہیں سے ڈرامے کا آغاز ہوتا ہے۔ پردہ اٹھنے کے بعد چند شدت پسند لوگوں کے

ذریعے ہندوستان کے خلاف پاکستان زندہ باد کے نعرہ لگا کر پاکستان لینے کی بات کہی جاتی ہے اور ساتھ ہی ایسے لوگوں کو گالیاں دیتے دکھایا گیا ہے جو پاکستان بنانے کی حمایت میں نہیں تھے۔ یہاں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اصل میں ملک کی تقسیم کوئی نہیں چاہتا تھا یہ تو چند مفاد پرست سیاست دانوں کی دین ہے جنھوں نے محض اپنے فائدے کے لیے زبان اور مذہب کا غلط سہارا لے کر نہ صرف ملک کے دو ٹکڑے کر دئے بلکہ ہندو اور مسلمان جسے سرسید احمد خان نے ہندوستان کی ایک خوبصورت دلہن کی دو آنکھوں سے تشبیہ دی تھی اس کو بھینگی بنا کر ان میں نفرت اور بغض کا زہر گھول کر ان کے بیچ دراریں پیدا کر دی ہیں۔ یہ دراریں اتنی گہری تھیں کہ آج بھی ان کو پُر نہیں کیا جا سکا ہے۔ آج بھی ملک میں مذہب، ذات اور زبان کے نام پر سیاست دانوں کے ذریعے لوگوں کے بیچ نفرتیں پھیلائی جا رہی ہیں۔ آج بھی لوگ مذہب اور ذات کے نام پر ایک دوسرے سے نہ صرف لڑ رہے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو جان سے مار کر خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ دراصل طبقاتی، مذہبی اور زبانوں کی تفریق سے ہی سماج میں نفرت کے بیج پنپتے ہیں، یہی بغض اور نفرت ہی سماج کو کھوکھلا کرتی ہے اور لوگوں میں پھوٹ ڈال کر بکھراؤ کرنے کا کام کرتی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم بھی لوگوں میں پھیلائی ہوئی نفرت کا نتیجہ تھی۔ ملک کو تقسیم کرنے والے ان چند شدت پسند سیاست دانوں اور لوگوں کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں تھا کیوں ان کی نظر میں وہی لوگ مسلمان کہے جانے کے لائق اور حق کے راستے پر تھے جو مسلم لیگ پارٹی کی حمایت کر ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں وہ شخص مسلمان کہلانے کے لائق ہی نہیں تھا جو کانگریس پارٹی کا ساتھ دے کر ملک کی تقسیم ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اس سے ان شدت پسندوں کی ذہنیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح سے انھوں نے بٹوارے کی سیاست کو مذہب سے غلط طور پر جوڑ کے پیش کیا اور ایسے لوگوں کو اسلام سے خارج کر کے ان کو گالیاں دیں جو بٹوارے کے ہرگز حق میں نہیں تھے۔ اس منظر کے آخر میں ایک گیت پیش کیا گیا ہے جس کے ذریعے سے تقسیم ملک کی صورتِ حال کو پیش کر کے اگلے منظر کے لیے ناظرین اور قاری کو ذہنی طور پر تیار کیا گیا ہے۔ گیت درج ذیل ہے:

اور نتیجے میں ہندوستاں بٹ گیا   یہ زمیں بٹ گئی آسماں بٹ گیا
طرزِ تحریر، طرزِ بیاں بٹ گیا   شاخ گل بٹ گئی، آشیاں بٹ گیا
ہم نے دیکھا تھا جو خواب ہی اور تھا   اور جو دیکھا تو پنجاب ہی اور تھا

جس نے لاہورنہیں دیکھاوہ جنما ہی نہیں'' از اصغر وجاہت وانی پبلیکیشن نئی دہلی ۲۰۰۶ء ص ۱۱

اس گیت کے ذریعے یہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نفرت اور تعصب کے نتیجے میں ہندوستان کے دوٹکڑے ہوئے تھے اور یہ نفرت اور تعصب جو سیاست دانوں کے ذریعے پھیلائی گئی تھی وہ اتنی شدید تھی کہ اس نے زمین یعنی ہندوستان و پاکستان کا بٹوارہ تو کیا تھا ساتھ ہی ساتھ آسمان یعنی تخلیق کرنے والوں کا بھی بٹوارہ کردیا۔ ساتھ ہی طرز تحریر اور طرز بیان یعنی زبان اور مذہب کا بھی بٹوارہ کردیا کہ اب پاکستان میں صرف مسلمان رہیں گے اور وہ اردو زبان بولیں گے، جبکہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پر پروان چڑھی اس لیے اس کو کسی خاص مذہب یا ملک کی زبان قرار دینا غلط تھا۔ ہندوستان جو دنیا روپی پیڑ کی ایک شاخ کے مانند ہے جہاں پر الگ الگ مذاہب، زبانوں اور تہذیبوں کے ماننے والے پھولوں کے مانند لوگ رہتے تھے ان کو بھی نہ صرف مذہب، زبان اور تہذیب کے نام پر بانٹ دیا گیا تھا اور لاکھوں لوگوں کو گھر سے بے گھر کر کے ان کے آشیانے کو چھین لیا گیا تھا۔ ملک کو انگریزوں سے آزاد کرا کر ترقی کے جو خواب ہم لوگ دیکھ رہے تھے وہ خواب تقسیم ہند کی وجہ سے چکنا چور ہو گیا تھا۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کا نقشہ ہی بدل گیا تھا یہاں تک کہ صوبہ پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ ہندوستان اور دوسرا پاکستان کو دے دیا گیا تھا۔

ڈراما ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جنما ہی نہیں'' جو اصغر وجاہت نے رسالہ ''ذہنِ جدید'' میں شائع کیا تھا اس کا آغاز ملک کی تقسیم کے بعد کے قصے سے ہوا ہے۔ ملک تقسیم ہونے کے بعد لکھنؤ کے ایک مہاجر سکندر مرزا کو اپنے اہل خانہ کے ساتھ مہاجر کیمپ میں کچھ مہینے گزارنے کے بعد کسٹوڈین آفس کے ذریعہ الاٹ کیے ہوئے مکان میں آتے دکھایا گیا ہے۔ ان کے مکالموں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ملک کی تقسیم سے ہندوستان اور پاکستان کی عوام کو کس طرح کی اذیتوں، پریشانیوں اور اضطراب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ صورت حال نہ صرف پاکستان کی تھی بلکہ ہندوستان کا بھی یہی حال تھا۔ دونوں ہی ملکوں میں شدت پسند لوگوں اور سیاست دانوں کے ذریعہ پھیلائے گئے تشدد اور نفرت کی وجہ سے لاکھوں لوگ گھر سے بے گھر ہو کر مہاجر بن کر ہجرت کرنے کے لیے مجبور ہو گئے اور ان کی برسوں کی محنت سے بنائی ہوئی زمین اور جائداد پر چند ہی لمحوں میں پانی پھر گیا۔ پہلے تو انھیں چند مہینے کیمپ میں گزارنے پڑے جہاں پر انھیں طرح طرح کی تکلیفوں، مصیبتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیمپ میں زندگی گزارنے کے کچھ

مہینے بعد کسی طرح گھر الاٹ بھی ہوا تو محض رہنے کی ہی جگہ ملی، کھانے کمانے کے لیے کوئی انتظام نہیں۔ لیکن وہاں بھی تفریق کی بنیاد پر، انتظامیہ اور سیاست دانوں کے قریبی اور رشتہ داروں کو مکان پہلے الاٹ کیے گئے اور ان کے بعد اگر کوئی مکان بچ رہا تو اسے عام لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ جب لاہور میں ہندوستان سے مہاجر بن کر گئے سکندر مرزا نے رتن کی ماں سے اپنے گھر سے نکلنے کو کہا تو وہ ضد پر اڑ گئیں اور ہندوستان جانے سے انکار کر دیا۔ سکندر مرزا اور رتن کی ماں کے بیچ ہوئے مکالموں کی ایک مثال درج ذیل ہے:

سکندر مرزا: بھئی آپ بات کو سمجھئے کہ اب یہاں پاکستان میں کوئی ہندو نہیں رہ سکتا۔۔۔

رتن کی ماں: میں تاں اِتھے ہی روانگی۔۔۔ جب تک رتن نئیں آ جادا۔۔۔۔

جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جنما ہی نہیں'' از اصغر وجاہت ''ذہن جدید'' جلد۔ ا شمارہ۔۲ دسمبر۔ فروری ۱۹۹۱ء ص ن ۵۲

ان مکالموں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکومت کے ذریعے الاٹیڈ مکان پر قبضہ کرنا انسان کا حق نہیں ہے لیکن جو انسان اپنی زمین و جائداد کو چھوڑ کر آیا ہو اور اس کے عوض میں اسے یہ مکان ملا ہو تو وہ بھلا اسے ہاتھ سے کیسے جانے دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ سکندر مرزا کو رتن کی ماں سے تھوڑی سختی سے پیش آنا پڑا۔ دوسرے یہ کہ جس انسان کو مذہب کے نام پر کچھ شدت پسند لوگوں نے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ہو اور اس کی آنکھوں کے سامنے کئی مسلم بے گناہوں کا قتل کر دیا گیا ہو تو اس کے دل میں کہیں نہ کہیں نفرت بیٹھ جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مرزا جیسا سیکولر انسان بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اب پاکستان میں کوئی ہندو نہیں رہ سکتا اور اس نے رتن کی ماں کو ہندوستان جانے کی صلاح دی تھی۔ دراصل لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی اس نفرت اور کدورت کو محبت، بھائی چارہ اور ایک دوسرے کے کام آ کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے بیگم مرزا کو جب لکڑیوں کی ضرورت پڑتی ہے اور انھیں رتن کی ماں اپنی لکڑیوں کو لینے کی اجازت دے دیتی ہیں تو ان کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس منظر کے آخر میں ناصر کاظمی کی ایک غزل پیش کی گئی ہے، جس میں نفرت اور بغض کی دیوار گرا کر آپسی بھائی چارہ اور محبت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اس کے بعد کسٹوڈین آفس کے ذریعے اس دور کے پاکستان کی انتظامیہ کے نظام کی صورتِ حال کو پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سے کسٹوڈین والے اور انتظامی امور کے لوگ جن

کا کام لوگوں کی مدد کر کے ان کو رہنے کے لیے جگہ فراہم کرنا تھا، وہ اپنے کام کو ٹھیک سے انجام دینے کے بجائے تفریح میں زیادہ وقت نکال دیا کرتے تھے۔ اسی سین میں چند شدت پسند انتظامیہ کے لوگوں کی خراب سوچ کو اجاگر کیا گیا ہے کہ کس طرح سے کسٹوڈین آفس کا کلرک جس کا کام لوگوں کی مدد کر کے شہر میں امن وامان قائم کرنا تھا وہ خود سکندر مرزا کو رتن کی ماں کو راستے سے ہٹانے کی غلط صلاح دیتا ہے۔ ان کی شدت پسندی اور تعصب کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کو ہندوستان نہ کہہ کر بھارت کہو کیوں کہ ان لوگوں کی سوچ کے مطابق ہندوستان میں اب کوئی مسلمان نہیں بچا، اسی وجہ سے وہ ہندوستان کو ہندوستان نہ کہہ کر بھارت کہتے ہیں۔ جبکہ اس وقت تو کیا آج بھی ہندوستان میں پاکستان سے زیادہ مسلمان ہیں۔ سکندر مرزا اور کلرک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تقسیم کے بعد پاکستان میں جو بھی افسر اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے تھے وہ زیادہ تر سندھی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور سندھی مسلمانوں سے ان کا خاص لگاؤ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان گئے تو ان میں جو ان اعلی افسران کے قریبی یا رشتہ دار تھے ان کو مکان پہلے الاٹ کر دیا گیا اور اس کے بعد باقی ماندہ مکانات کو دوسروں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ صورت حال نہ صرف پاکستان کی تھی بلکہ ہندوستان کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ پاکستان سے آئے ہوئے مہاجرین کو ان کا حق نہیں ملا۔ حق تو یہ تھا کہ جو بھی مہاجر ہندوستان سے پاکستان گئے ہیں ان کی زمین اور جائدادکو وہاں سے ہجرت کر کے آئے مہاجروں میں تقسیم کر دیا گیا ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انتظامیہ اور یہاں کے لوگوں نے ان زمین وجائداد پر قبضہ کر لیا اور مہاجروں کو ان کے حق سے محروم کر دیا گیا۔

ڈراما نگار اصغر وجاہت نے تقسیم کے بعد پاکستان کے شہر لاہور کے حوالے سے دونوں ملکوں کی تباہی وبربادی کو بنیاد بنا کر یہ بات پیش کی ہے کہ لاہور جو تقسیم سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہرا بھرا چمن تھا۔ دونوں قوم کے لوگ ایک ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ لوگوں کے بیچ تعلقات اتنے گہرے تھے کہ وہ عید اور دیوالی ایک ساتھ مناتے تھے، تجارت اور کاروبار اور روزمرہ کی ضروریات میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور قبرستان اور شمشان میں دونوں کے لیے جگہیں تھیں۔ جو یہ دکھاتا ہے کہ ملک میں قومی یکجہتی اور بھائی چارہ تھا، لیکن جب تقسیم کی وجہ سے ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوا اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو وہاں کے بہت سے ہندو لوگ ہندوستان چلے آئے جس کی وجہ سے وہاں کے کچھ شہر اور گاؤں

ویران ہوگئے تھے اور اگر مائی جیسے کچھ لوگ بچ بھی گئے تو انھیں شمشان، پوجا اور تہواروں کو اپنے طور پر منانے جیسے بہت سارے مسائل سے دوچار ہونا پڑا اور جو مسلم لوگ ہجرت کرکے پاکستان گئے انھیں ان کے حق سے محروم کیا گیا اور مہاجر کہہ کر پکارا گیا۔ آج بھی ان کی صورت حال ویسی ہی ہے جیسے وہ ہندوستان سے لٹ لٹا کر گئے تھے۔ یہی حال ہندوستان کا بھی تھا یہاں سے جب مسلمان ہجرت کرکے پاکستان گئے تو یہاں بھی نہ جانے کتنے گاؤں، شہر، قبرستان، درس گاہیں اور مسجدیں ویران ہوئی تھیں۔ دونوں ہی ملکوں کا امن وامان چھن گیا اور ہندو مسلم قوموں میں اتحاد اور بھائی چارہ بس برائے نام رہ گیا تھا۔ تقسیم سے پہلے ہندوستان مختلف مذاہب، کلچرس، تہذیبوں اور زبانوں کا گہوارہ تھا اور سبھی مذاہب کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ لیکن پہلوان (محلّے کا مسلم لیگی نیتا، مہاجر بدمعاش) جیسے متعصب اور شدت پسند لوگوں کی وجہ سے اسے فرقہ وارانہ روپ دے کر مذہب اور زبان کے نام پر بانٹ دیا گیا۔ ملک کے سیکولر لوگوں کو تو اس تقسیم سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ ان کے جان اور مال دونوں کا نقصان ہوا۔ لیکن پہلوان جیسی سوچ کے لوگوں کو اس تقسیم سے ضرور فائدہ پہنچا۔ حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی اور لوگوں کے بیچ نفرت اور تعصب پھیلا کر سیاست کرنا آسان ہوگیا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اپنے آپ کو تو قوم وملت کا ہمدرد اور ہمنوا کہتے تھے لیکن جب بٹوارے کے بعد فرقہ وارانہ فساد ہوا تو سب سے زیادہ قتل وغارت اور لوٹ مار انھوں نے کی۔ اس کا اندازہ پہلوان کے اس مکالمے جس میں بڑھیا کے بچنے اور مال دبانے کی بات کہی گئی ہے سے لگایا جاسکتا ہے۔ پہلوان جیسے شدت پسند لوگوں کو پاکستان میں کسی غیر مسلم کا رہنا گوارا نہیں تھا لیکن جھوٹ اور مذہب کا غلط سہارا لے کر کسی کی جائداد پر قبضہ کرنا، کسی کو مارنے کے لیے رشوت لینا گوارا تھا جیسا کہ پہلوان نے رتن جوہری کی ماں کو راستے سے ہٹانے کے لیے رشوت لی اور اس کے مکان کی اوپر والی منزل جس پر رتن کی ماں رہتی تھی اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اصغر وجاہت نے رتن کی ماں اور سکندر مرزا کو مذہب الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے کام آنے اور خوشی خوشی ایک گھر میں رہنے سے ہندو اور مسلم اتحاد کی بات کہی ہے اور تقسیم کی وجہ سے لوگوں کی مسمار زندگی کو نئے سرے سے جینے کے لیے یاد دہانی کرانے کی کوشش کی ہے تاکہ لوگوں کے اندر بچی ہوئی انسانیت پھر سے جاگ اٹھے اور لوگ تقسیم کے سانحے کو بھول کر انسانیت اور آپسی بھائی چارے کی زندگی گزارنے لگیں۔

ملک کی تقسیم ایک سانحہ تھا جو شدت پسندوں اور سیاست دانوں کی سوچی سمجھی سازش تھی جس کا شکار ملک کے سبھی لوگ ہوئے تھے۔اصل میں اکثریت اتنے بڑے حادثے کو دیکھ کر ساکت اور بے حس رہ گئی تھی اور وہ اس کا فوری طور پر علاج چاہتی تھی۔ یہ علاج تبھی ممکن تھا جب لوگ مذہب، ذات اور زبان کے نام پر لڑنا چھوڑ دیں اور ضرورت پر ایک دوسرے کے کام آئیں۔اصغر وجاہت نے اس کے لیے رتن کی ماں کے کردار کی تخلیق کی ہے اور اس کردار کے اندر جو دو عنصر ڈالے ہیں، وہ رواداری اور خدمت گزاری کے ہیں۔ وہ جب سکندر مرزا کے اہل خانہ کو الگ مذہب ہوتے ہوئے بھی اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دیتی ہے یہی چیز محبت اور بھائی چارے کی مثال ہے۔اس کی شروعات وہاں سے ہوئی جب وہ مرزا کی بیگم کی تیمارداری کی بات کرتی ہے۔اصغر وجاہت نے ان سب باتوں کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ پڑوس کی بیگم ہدایت حسین کو ایک ٹوکری کوئلے کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ بیگم سکندر مرزا کے یہاں آتی ہیں تو رتن کی ماں کا ایک کے بجائے دو ٹوکری کوئلے دینا اور اجازت دیتے وقت یہ جملے کہنا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، میں ایک طرح کا روحانی لگاؤ ہے۔ رتن کی ماں کا لوگوں کی کی تیمارداری کرنا، ان کی ضرورت کے موقعے پر کام آنا اور لوگوں کی خدمت کرنے کی پہل کرنا۔اس بیچ بیگم حمیدہ کا آداب کہتے ہوئے بوا کہہ کر پکارنا اور رتن کی ماں کا مسکرا کر یہ کہنا کہ بیٹی مجھے ماں جی کہہ کر بلایا کر،اس پر غلطی کی تلافی کرتے ہوئے بیگم حمیدہ کا یہ کہنا کہ بیٹھیے ماں جی۔ یہ سب باتیں انسان دوستی، رواداری، اتحاد، محبت اور بھائی چارہ کی عمدہ مثال ہیں جو لوگوں کو تقسیم کے سانحے اور فرقہ ورانہ تشدد بھلا کر اتحاد اور بھائی چارہ کے نئے تعلقات قائم کرنے کی تعلیم دیتی ہیں اور تاریخ کے خلاف انسانیت کی تعمیر کی پہل کراتی ہیں۔سکندر مرزا کے خاندان کو نقل مکانی کا دکھ، درد رتن کی ماں سے زیادہ نہیں تھا کیوں کہ مرزا کا ملکی تبادلے میں صرف گھر بار چھوٹا تھا لیکن اس بوڑھی عورت کا پورا خاندان اجڑ گیا تھا جس کے ذمہ دار پاکستان کے سیاست دان اور پہلوان جیسے شدت پسند لوگ تھے۔اس کے باجود بھی اس بوڑھی عورت کے دل میں ان لوگوں کے لیے ذرا سا بھی تعصب نہیں تھا۔ وہ نہ صرف پاکستان میں رہ کر مسلمان لوگوں کی خدمت کرتی رہی بلکہ اس نے سکندر مرزا کو اپنے گھر میں پناہ دی۔رتن کی ماں کی ان سب خوبیوں سے لوگوں کو یہ تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ظلم وتشدد، نفرت وعدم رواداری کسی مسئلے کا حل نہیں ہے، اس سے لوگوں کے بیچ دوریاں بڑھتی ہیں۔ملک میں اگر انسانیت اور بھائی چارہ قائم کرنا ہے تو رتن کی ماں کی

طرح لوگوں سے محبت کے جذبے اور دوسروں کے لیے ایثار و قربانی اور رواداری کی مثال قائم کرنی ہوگی۔

اس ڈرامے کے ایک سین میں سکندر مرزا کا لڑکا جاوید رتن کی ماں کو راستے سے ہٹانے کے لیے پہلوان سے بات کرتا ہے لیکن جب سکندر مرزا کی شریک حیات حمیدہ بیگم کو یہ پتہ چلتا ہے تو وہ اپنے بچوں کی قسم دلا کر یہ کام نہ کرنے کے لیے کہتی ہیں بعد میں مرزا کا دل بھی نرم ہو جاتا ہے اور اس غلط فیصلے کو ملتوی کر کے مائی کے ساتھ ایک ہی گھر میں خوشی خوشی زندگی گزارنے کے لیے راضی ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ تعصب اور نفرت کسی بھی مسئلہ کا حل نہیں ہے، سماج میں اس کا فروغ ہر پہلو سے ایک منفی عمل ہے۔ آج معاشرے میں فرقہ واریت، عدم رواداری، تشدد اور مذہبی خلفشار وغیرہ جیسی جو بھی برائیاں ہیں وہ سب نفرت اور تعصّبات کی بنا پر جنم لیتی ہیں اس لیے اگر معاشرے میں امن و امان، چین اور سکون چاہیئے تو لوگوں کا ہر طرح کے تعصب کو بھلا کر محبت، بھائی چارہ اور آپسی اتحاد قائم کرنا ضروری ہے۔ ڈرامے کے ایک اور سین میں جب رتن کی ماں سکندر مرزا سے دیوالی پر دئے جلانے اور پوجا کرنے کی اجازت مانگتی ہیں تو مرزا کا یہ کہنا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، آپ کا گھر ہے آپ شوق سے کیجیئے جو آپ کرتی ہیں۔ اس بیان میں اور بوڑھی عورت کے کوئلے دینے والے بیان میں تکرار ہے دونوں بیانوں میں محبت اور بھائی چارے کی یکساں جھلک ہے۔ سکندر مرزا اور مائی کا ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہ کر اپنے اپنے مذاہب پر عمل کرتے ہوئے زندگی گزارنا، ہندو مسلم اتحاد کی عمدہ مثال ہے۔ ڈرامے کے ان مکالموں سے ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے، بھائی چارہ قائم کرنے اور لوگوں کے اندر انسانیت کا جذبہ پیدا کرنے کی اطلاع ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اس ڈرامے میں پہلوان جیسے غلط سوچ کے لوگوں کی تنگ نظری کو دکھایا گیا ہے جو مذہب کا علم نہ رکھتے ہوئے بھی اس کو غلط طور پیش کر کے بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان شدت پسند لوگوں کو پاکستان میں کسی ہندو عورت کا رہنا اور اس کا اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے راوی ندی میں صبح غسل کرنا اور پوجا کرنا انھیں ناگوار اور کفر لگتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے ہندو لوگوں سے تعلقات رکھنا انھیں دین و ایمان کے خلاف بغاوت جیسا لگتا ہے۔ جب کہ اسلام ایک دوسروں کے ساتھ حسن اور اخلاق کا درس دیتا ہے تا کہ زندگی میں امن و سکون قائم رہے اور لوگوں میں آپسی بھائی چارہ، اخوت و محبت اور اتحاد و اتفاق قائم ہو سکے۔

اس ڈرامے کے ایک سین میں ماں، بیٹی کے مکالموں سے یہ حقیقت بتانے کی کوشش کی گئی

ہے کہ ملک کی تقسیم کا فیصلہ نہایت غلط اوراحمقانہ قسم کا تھا کیوں کہ جب ایک ہی گھر میں رتن کی ماں اورسکندر مرزا کا خاندان جیسے ہندو ومسلم مذہب کے لوگ رہ سکتے ہیں تو ایک ملک میں کیوں نہیں رہ سکتے تھے؟ اس کے بعد کے سین میں پہلوان جیسے لوگوں کو جو مسلم مذہب کو غلط طور پر پیش کرتے ہیں۔ان شدت پسندوں کی اصلاح کے لیے اصغر وجاہت نے مولوی اکرام الدین کے کردار کا تخلیق کیا ہے۔ جو اسلام کی دریا دلی اور ہمدردی کی علامت ہیں اوراس کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ جب پہلوان اوراس کے ساتھی سکندر مرزا کی شکایت مولوی صاحب سے کرتے ہیں کہ ان کے گھر میں کفر کا کام ہوتا ہے،تو اس موضوع پر مولوی صاحب کا مکالمہ اسلام کی سچی تصویر پیش کرتا ہے،جس میں غصے کو عقل کا دشمن بتایا گیا ہے،دوسروں کے مذاہب کو برا بھلا کہنے اورلوگوں کو مذہب، رنگ،نسل اور ذات وغیرہ کے نام پرتفریق کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ساتھ ہی بیوہ کا اسلام میں حقوق،غم زدہ کی مدد کرنا اور مظلوموں کی مدد کرنا بتایا گیا اورلوگوں کی خدمت کرنے کوانسان کا زیور بتایا ہے کیوں اللہ تعالی اس سے بہت خوش ہوتا ہے۔لیکن مولانا کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی پہلوان کے اندر کوئی بدلاؤ نہیں آتا ہے۔ایک طرف ہمیشہ سب کی خوشی اور غم میں حصہ لینے کی وجہ سے پورا محلّہ رتن کی ماں سے پیار کرنے لگتا ہے، پر کچھ لوگوں کو یہ برداشت نہیں ہوتا ہے اور وہ اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ یہ بات جب رتن کی ماں کو پتا چلتی ہے تو وہ ایک دن اپنا سامان اٹھا کر ہندوستان جانے لگتی ہیں تو مرزا کا خاندان جو پہلے انھیں جانے لیے کہتا تھا وہی انھیں روکتا ہے۔اس منظر میں جب رتن کی ماں ناصر کاظمی اور تانگے والے سے یہ کہتی ہیں کہ ''میں دلّی جانا چاہتی ہوں، میں یہاں نہیں رہنا چاہتی ہوں۔'' تو وہ لوگ بھی انہیں روکتے ہیں۔تانگے والا کہتا ہے۔''تم ہماری ماں ہو، یہ مت کہو کہ تم ہماری ماں نہیں رہنا چاہتی۔'' شاعر ناصر کاظمی کہتے ہیں کہ ''ماں جی! ننگا آدمی صرف ننگا ہوتا ہے نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان۔'' یہ فرقہ ورانہ ہم آہنگی اور باہمی میل جول کی ایک عمدہ مثال ہے، جو ہندو اور مسلم کے مابین مذہبی نفرت کے تناور درخت کو اکھاڑ پھینکنے اور لوگوں میں مساوات اور امن کی فضا کی کوشش ہے۔

رتن کی ماں کے انتقال کے بعد جب جاوید،علیم کی چائے کی دوکان پر آکر بہت افسردگی کے ساتھ آکر یہ خبر دیتا ہے تب وہاں پر بیٹھے شاعر ناصر کاظمی اور دوسرے لوگ ہراساں رہ جاتے ہیں۔سب لوگ مرزا صاحب کے گھر پر جمع ہوجاتے ہیں۔اب سوال اٹھتا ہے کی مرحومہ کی آخری رسومات کو کس طرح

ادا کیا جائے، کیوں کہ اب تو شہر میں نہ تو کوئی ہندو بچا ہے اور نہ ہی شمشان گھاٹ۔ اس لیے لوگوں کی پیش کش یہ تھی کہ انھیں دفنا دیا جائے۔ لیکن تبھی مولانا صاحب آجاتے ہیں اور وہ ایک متاثر کن بات کہتے ہیں۔ ''دیکھیئے وہ مرچکی ہے، اس کی میت کے ساتھ آپ لوگ جو سلوک چاہیں کر سکتے ہیں۔۔۔ اسے چاہے دفن کیجیئے، چاہے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیے، چاہے غرق آب کر دیجیئے۔۔۔ اِس کا اب اُس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔۔۔ اُس کے ایمان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ لیکن آپ اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں اس سے آپ کے ایمان پر فرق پڑ سکتا ہے۔'' کافی غور و فکر کرنے کے بعد مولانا کی صلاح و مشورے سے مرحومہ کی لاش کو راوی ندی کے کنارے ہندو رسم و رواج کے مطابق نذرِ آتش کرنے کے لیے سبھی لوگ تیار ہو جاتے ہیں۔ مولانا کے اس مکالمے کے ذریعے اصغر وجاہت نے اسلام کی سچی تصویر پیش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مردہ چاہے کسی بھی مذہب کا کیوں نہ ہو اس کا احترام فرض ہے۔ کیوں کہ اسلام خود غرضی نہیں سکھاتا ہے بلکہ وہ دوسروں کے مذہب اور جذبات کا احترام کرنا سکھاتا ہے۔

ڈرامے کے آخری منظر میں رتن کی ماں کی وفات کے بعد ان کی تجہیز و تکفین یا کریا کرم ہندو رسم و رواج کے مطابق کرنے کے لیے دئے گئے مولوی صاحب کے فتوے سے ناراض ہو کر چند دقیا نوس شدت پسند غنڈوں کو یہ برداشت نہیں ہوتا ہے اور وہ طیش میں آکر مولوی صاحب کا قتل کر دیتے ہیں۔ مولوی صاحب اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر سچ اور حق کے راستے پر چلتے ہوئے اپنی جان قربان کر کے انسانیت اور بھائی چارے کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ مائی یعنی رتن کی ماں کی جانب داری میں سکندر مرزا، ناصر کاظمی اور مولوی صاحب جیسے لوگ کھڑے ہیں۔ یہ لوگ سماج کے ایسے لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو ملک میں انسانیت اور بھائی چارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ملک میں اسی انسانیت اور بھائی چارے کو قائم کرنا ہی اس ڈرامے کا مرکزی خیال ہے۔ ہندوستان کو ہزار برس کے تناظر میں دیکھیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ڈراما نگار اصغر وجاہت اور ہدایت کار حبیب تنویر نے ہر حال میں انسانی حساسیت، قدر و قیمت اور صحیح روایتوں کو معنی خیز بنائے رکھا ہے۔

ڈرامے کے آخر میں مولوی صاحب کی شہادت کے بعد اسٹیج پر ان کی میت رکھی ہوتی ہے اور اس کے دونوں طرف سے لوگ سر جھکائے ہوئے ایک درد بھرا گیت گاتے ہوئے گزرتے ہیں اور ڈراما ختم ہو جاتا ہے۔ دراصل ان دونوں موتوں کے ذریعے ایک طرف اصغر وجاہت انسانی محبت اور باہمی احترام

کے خاتمے کو دکھاتے ہیں اور دوسری طرف نفرت اور ظلم کی حد درجہ انتہا، جسے ہم سب اپنے معاشرے، سماج اور ملک میں پالتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کے مذہب کا احترام نہیں کرتے صحیح معنوں میں وہ خود اپنے مذہب کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں، کیوں کہ دنیا کا ہر مذہب دوسرے مذاہب کا احترام سکھاتا ہے۔ جہاں تک کسی انسان کو قتل کرنے کی بات ہے تو کوئی بھی مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ حقیقت میں یہ بے شعور اور وحشی عمل ہے جو آخر میں نہ تو مذہب دیکھتا ہے،، نہ مذہبی رہنما، نہ عبادت، نہ خدا اور نہ ہی زبان۔ پہلوان بھی رتن کی ماں کی طرح پنجابی بولنے والا تھا اور مولوی صاحب کی طرح مسلمان اور اپنے آپ کو قوم کا خادم کہنے والا تھا، لیکن اس کی اسی نفرت اور تعصب نے اسے نہ صرف ایمان سے خارج کر دیا بلکہ اسے جانوروں کی طرح بے حس بنا دیا۔ پہلوان سماج کے ایسے برے لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو ملک میں نفرت پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بنیادی طور پر دوسروں کے مذاہب اور ذات کو تباہ ہی نہیں کرتے بلکہ جہاں جہاں بھی آپسی بھائی چارہ، مذہبی اتحاد اور انسانیت ہے اس کو مسمار کرتے ہیں۔

حبیب تنویر نے جب اس ڈرامے کو اپنی ہدایت میں اسٹیج کیا تو انھوں نے اس میں Climax کے ساتھ Anti Climax پیش کر کے اسے اور بھی اثر انداز اور معنی خیز بنا دیا۔ انھوں نے ڈرامے کے آخر میں صرف مولوی صاحب کی میت دکھانے کے بجائے مولوی صاحب کا جنازہ اور مائی یعنی رتن کی ماں کی ارتھی ساتھ ساتھ دکھائی ہے، اس سے قومی یک جہتی اور بھائی چارہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن جب ناظرین یہ دیکھ رہے ہوتے ہیں تبھی فساد برپا ہو جاتا ہے اور لوگ جنازہ اور ارتھی چھوڑ کر اپنی اپنی جان بچانے میں لگ جاتے ہیں۔ حبیب تنویر نے ڈرامے کے اس سین کے ذریعے زندگی کو ایک نیا معنی و مفہوم دینے کی کوشش کی ہے، جو سوالوں کی طرح بار بار ہمارے سامنے آتے ہیں کہ سماج کے اندر امن و امان، چین و سکون اور ہم آہنگ عناصر کو آخر کون مسمار کر رہا ہے؟ انسانی رشتوں کو مستحکم کیسے کیا جائے؟ انتہا پسند ذہن والے لوگوں سے کس طرح لڑا جائے؟ مذہبی رہنماؤں یا سیکولر طاقتیں! اتحاد و باہمی اخوت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے بڑے پیمانے پر ان کی کوشش کی ثمر آوری کیسے ہو سکتی ہے؟۔

ڈراما ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جمیا ہی نہیں'' کا پلاٹ سادہ، آسان اور سلجھا ہوا ہے۔ یہ ڈراما کل اٹھارہ مناظر پر مشتمل تھا لیکن بعد میں اصغر وجاہت نے اسے کل سولہ مناظر میں تقسیم کر کے کتابی

شکل میں شائع کیا ہے۔اس میں تقسیم ہند کے بعد کے پاکستان کی صورتحال کے پس منظر میں رتن کی ماں اور سکندر مرزا کا جو قصہ پیش کیا ہے وہ شروع سے آخر تک ایک فطری تسلسل کے ساتھ چلتا ہے۔ یہ قصہ ایک پنجابی ہندو عورت جو تقسیم کے بعد لاہور میں رہ گئی تھی، اس کے سچے اور حقیقی واقعہ پر مبنی ہے۔ اصغر وجاہت نے مہاجروں کی نقل مکانی کے اس قصے پر پوری نظر رکھی ہے۔ اس میں کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں جسے انھوں نے ڈرامے میں یوں ہی پیش کر دیا ہو۔ ڈرامے کے سبھی سین یا مناظر میں ایک خاص قسم کا ربط وضبط ہے جسے اصغر وجاہت اور اس کے ہدایت کار حبیب تنویر نے ناصر کاظمی، فراق گورکھپوری، امریتا پریتم اور راہی معصوم رضا وغیرہ کی شاعری کا بہت ہی خوبصورت اور معنی خیز استعمال کر کے اس ڈرامے کی پیش کش کو اور بھی زیادہ فطری اور اثر انداز بنا دیا ہے۔ ڈرامے کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ اس کا آغاز، وسط اور اختتام تینوں ہی دلچسپ اور اثر انگیز ہے۔ اس میں دو کرداروں کی سوچوں کے بیچ کشمکش کو پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ برائی واچھائی، نفرت ومحبت، تشدد وامن، ظلم وعدل، باطل وحق اور کفر وایمان کے بیچ تصادم پیش کیا گیا ہے۔ پہلوان کا مسجد میں جا کر مولوی صاحب کو قتل کرنے کا سین ہی ڈرامے کا نقطۂ عروج ہے، یہیں سے ڈراما ایک نیا موڑ لیتا ہے اور اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ لیکن حبیب تنویر نے جدید ڈراموں کی طرح اس میں بھی Climax کے ساتھ ساتھ Anti Climax کو پیش کیا ہے تا کہ ناظرین خود کا محاسبہ کر کے صحیح اور غلط کا فیصلہ خود کر لیں۔

کردار نگاری کے اعتبار سے بھی یہ ڈراما بہت ہی جاندار ہے۔ اس میں متحرک اور غیر متحرک دو طرح کے کردار ہیں۔ رتن کی ماں، سکندر مرزا، مولوی صاحب اور ناصر کاظمی وغیرہ یہ وہ کردار ہیں جو جیتے جاگتے ہیں۔ یہ کردار نہ صرف اعلی سیرت نگاری کے مالک ہیں بلکہ اپنی نیک سیرت سے سماج کو بدلنے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ کردار سماج کے اچھے لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہیں پہلوان، انوار، سراج اور رضا وغیرہ ڈرامے کے ایسے کردار ہیں جو غیر متحرک ہیں، جنھیں نہ تو مذہب کی کوئی فکر ہے اور نہ ہی ملک یا سماج کی۔ یہ کردار ملک کے انتہا پسند لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ڈرامے کا سب جاندار اور متحرک کردار رتن کی ماں کا ہے۔ ڈرامے کے سبھی اہم کردار انفرادیت اور امتیازی اوصاف کے مالک ہیں۔ یہ انفرادیت ان کے کردار میں اتنی نمایاں ہے کہ ناظرین اور قارئین آسانی سے انھیں پہچان سکتے ہیں۔ اصغر وجاہت نے مولوی صاحب اور ناصر کاظمی کے کردار کو اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ ڈرامے کے

مرکزی کردار بن کر ڈرامے کے دوسرے کرداروں سے بلند نظر آنے لگے ہیں۔

ڈراما ''جس نے لاہور نہیں دیکھاوہ جماہی نہیں'' میں اصغر وجاہت نے جو مکالمے پیش کیے ہیں وہ تکلف اور تصنع سے پاک اور موقع محل کی مناسبت سے مناسب اور موزوں ہیں۔ یہ مکالمے کہانی کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ کرداروں کی شخصیت کو بھی واضح کرتے ہیں۔ اصغر وجاہت نے کرداروں کے معاشرے کے مطابق ان کے مکالمے پیش کیے ہیں۔ جیسے رتن کی ماں، پہلوان اور اس کے دوستوں کا تعلق لاہور سے تھا، اس وجہ سے وہ پنجابی زبان میں اپنے مکالمے ادا کرتے ہیں۔ سکندر مرزا کا تعلق چونکہ لکھنؤ سے تھا اس لیے ان کے مکالموں کی زبان خالص اردو ہے اور مولوی صاحب کی زبان پر چونکہ پنجابی کا اثر ہے اس لیے ان کے مکالمے پنجابی اثر کی اردو زبان میں ہیں۔ ناصر کاظمی کو اس ڈرامے میں بھی ایک شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اس لیے ان کے مکالمے شاعرانہ اور فلسفیانہ قسم کی خالص اردو زبان میں ہیں۔ اس ڈرامے میں اصغر وجاہت نے خود کلامی اور لمبے مکالموں سے گریز کر کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں اپنی بات کہی ہے جس سے ناظرین کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ ڈرامے کے ایک اقتباس کی مثال درج ذیل ہے:

سکندر مرزا: آداب عرض ہے۔۔۔تشریف رکھیے۔

حمیدہ بیگم: آیئے بیٹھیے۔

رَتن کی ماں: جیندے رہو۔۔۔ پتُر جیندے رہو۔۔۔ تواڈی کڑی نے آج مینوْ دادی' کہہ کے پکارا (آنکھ سے آنسو پوچھتے ہوئے)۔

سکندر مرزا: معاف کیجیئے، آپ کے جذبات کو مجروح کرنا ہمیں منظور نہ تھا۔ ہم آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے۔۔۔

جس نے لاہور نہیں دیکھاوہ جماہی نہیں'' از اصغر وجاہت ''ذہن جدید' جلد۔۱ شمارہ۔۲ دسمبر۔فروری ۱۹۹۱ء ص ن ۵۷

درج بالا اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ڈرامے کی زبان سلیس، سادہ، ادبی اور عام فہم ہے۔ اس میں اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان کا استعمال بھی ہوا ہے، اس کی وجہ یہ کہ اس ڈرامے کی مرکزی کردار رتن کی ماں اور ڈرامے کے منفی کرداراوراس کے دوست کی مادری زبان پنجابی ہے اس لیے پنجابی زبان کا استعمال فطری تھا۔سکندر مرزا چونکہ ہندوستان کے لکھنؤ سے ہجرت کر کے لاہور تشریف لائے تھے اس لیے ان کی زبان خالص اردو میں ہے۔

اسٹیج کے لحاظ سے ڈرامے میں سب سے چیلینجنگ کردار رتن کی ماں کا ہے، جس کے دل میں معاشرے کے سبھی لوگوں کے لیے محبت اور شفقت ہے۔ انھیں پتہ ہے کہ کچھ لوگ ان کی جان کے دشمن ہیں مگر وہ ان کی فکر سے بے پرواہ ہوکر اچھے راستے پر چلنے کا جذبہ رکھتی ہیں۔ مرزا کا کردار بھی اپنے اندرونی ہیجان و کش مکش کی وجہ سے چیلنج بھرا ہوا ہے۔ ناصر کاظمی کا کردار بیباک بات کرنے والا، انسانیت کا پیروکار ہے اور حاضر جواب فطرت والا ہے۔ اس کے کردار کو بھی بخوبی ادا کرنا حبیب تنویر کے لیے ایک چیلنج ہی تھا۔ انھوں نے اپنے تھیٹر گروپ ''نیا تھیٹر'' کے چھتیس گڑھی اداکاروں کے ساتھ اس ڈرامے کو بخوبی اسٹیج پر پیش کیا۔ اس کو اسٹیج کرتے وقت انھیں اس کی اسکرپٹ میں تھوڑی بہت تبدیلی کرنی پڑی تھی اور کچھ مناظر کو ابھارنے کے لیے کہیں کہیں کچھ نئے مکالمے گھڑنے اور گیتوں کو سہارا لینا پڑا تھا۔ حالاں کہ اس کی حقیقت پسندی کی بنیادی شکل سے چھیڑ چھاڑ قطعی نہیں کی گئی تھی۔ انھوں نے اس ڈرامے کی اسٹیج پیش کش کے دوران کل پانچ گیتوں اور غزلوں کو کورس کے انداز میں شامل کر کے ڈرامے کے دو مناظر کے بیچ ربط پیدا کیا ہے۔ ان گیتوں اور غزلوں کی وجہ سے ڈراما اور بھی جاندار اور اثر دار ہو گیا ہے۔ ڈرامے کی سب سے بڑی کمی جو اسٹیج کی رکاوٹ کا سبب بنتی تھی وہ تھی مناظر کی کثرت، اسی وجہ سے ڈرامے کے پورے واقعے کو حبیب تنویر نے کم ہی منظر میں تقسیم کر کے اسٹیج کیا۔

''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جنما ہی نہیں'' ہندوستان کی تقسیم کے سانحے پر مشتمل ایک حزنیہ ڈراما ہے، جو ملک کے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کے ذریعہ جان بوجھ کر ہوا دی گئی فرقہ واریت کے اثرات کی بہت المناک اور درد بھری تصویر پیش کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں سماج میں مثبت تبدیلی لانے کی غرض سے اچھے اور برے انسان کی پہچان کرائی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان، انسان ہوتا ہے اس میں ہندو اور مسلم کی تفریق نہیں ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہ ڈراما ہندو اور مسلم کے بیچ پھیلی ہوئی بدلی کو دور کرنے

کی کوشش ہے جو ہندو مسلم اتحاد، محبت اور بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے اور ملک، مذہب اور ذات پات کے نام پر ہوئی اور ہو رہی گندی سیاست اور تشدد و فرقہ واریت کا پردہ فاش کرتا ہے اور انسانی قدروں کی جڑیں کاٹ دینے والی سیاسی طاقت اور حکمت عملی کے فریب کا انکشاف کرتا ہے۔ تاکہ ملک میں قومی یکجہتی اور رواداری کا فروغ ہو سکے اور لوگوں کے بیچ آسانی سے رشتے مستحکم اور مضبوط ہو سکیں۔ ملک میں ہم آہنگ ثقافت کس طرح قائم ہو اس پر بہت ہی سنجیدگی سے غور و فکر کیا گیا ہے، ساتھ ہی مذہب کی اچھائیوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈرامے کے وہ پہلو جو اصغر وجاہت کو دوسرے ڈراما نگاروں سے الگ کرتے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اس میں انھوں نے مولوی صاحب کے کردار کو تنگ نظر والا، دقیانوس خیالوں والا انسان پیش نہیں کیا ہے، بلکہ وہ ہر طرح کی برائیوں سے پاک اور انسان دوست و ہمدرد ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں انھوں نے رتن جوہری کی جو 22 کمروں والی حویلی پیش کی ہے اس حویلی کو ایک تمثیلی کردار کی شکل میں اس ڈرامے میں پیش کیا ہے، جو دراصل ہمیں اپنے اندرون میں جھانکنے پر مجبور کرتی ہے۔ تیسرا یہ کہ ایک ہی مکان میں مائی اور مرزا کا اختلافِ مذاہب کے باوجود خوشی خوشی رہنا انسانیت، بھائی چارہ اور ہندو مسلم اتحاد کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ چوتھا یہ کہ مسجد میں مولوی صاحب کا قتل ایک علامت ہے جس سے اصغر وجاہت نے خود غرض لوگوں کے ہاتھوں مذہب اور انسانی قدروں کو پامال کرنے کی روش کو اجاگر کیا ہے۔ اس ڈرامے کے ذریعے اصغر وجاہت نے ہندوستانی سماج کی مشترکہ ثقافت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی کوشش کی ہے، کیوں کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ نفرت پھیلا کر ان پر حکومت کرنے کی گندی سیاست کھیلی تھی۔ بعد میں یہی نفرت آمیز سیاست ہندوستانی سماج کے لیے ناسور بن گئی اور آج تک اس کی چوٹ سے ہندوستانی سماج مستثنیٰ نہیں ہو سکا۔ ہندو اور مسلم کے بیچ لگاتار بڑھ رہی بے اعتقادی سے نہ جانے کتنے لوگ فرقہ پرستی کی آگ میں جھلس گئے اور نہ جانے کتنے اور جھلسیں گے۔ آج بھی سماج میں لوگوں کے بیچ نفرتیں لگاتار بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہ ڈراما سماج میں بڑھتی جا رہی نفرتوں کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہے۔

☆☆☆